مرکب جملے (۳)

تابع جملے:

اصلی جملے کو خاص جملہ اور ماتحت جملے کو تابع جملہ کہا جاتا ہے۔

تابع جملوں کی تین اقسام ہیں۔

اسمی، وصفی، تمیزی

اسمی جملہ: اس طرح کے جملوں کی ابتدا عموماً ''کہ'' سے ہوتی ہے۔ جیسے:

اُس نے کہا کہ میں بیمار ہوں۔

کون نہیں جانتا کہ وہ ایک شریف آدمی ہے۔

جلسے میں وہ ہلڑبازی ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔

کبھی کبھی چھوٹے فقروں اور مقولوں سے ''کہ'' حذف ہو جاتا ہے۔ مثلاً:

میں نے کہا جاؤ اب نہ آنا۔

کبھی خاص جملہ کی فعل کی وجہ یا مقصد کے اظہار کے لیے استعمال ہوتا ہے ایسے جملوں میں کبھی کبھی ''کہ'' سے پہلے ''کیوں کہ'' یا ''اس لیے'' بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے:

بلب بجھا دو کہ میں سو سکوں۔

وہ اس بچے سے بڑی محبت کرتا ہے اس لیے کہ وہ اُس کا اکلوتا بیٹا ہے۔

میں باہر جاتے ہوئے ڈرتا ہوں کیوں کہ باہر اندھیرا ہے۔

بعض اوقات تابع جملہ منفی فقرے کے اظہار کے لیے ''ایسا نہ ہو'' کے ساتھ آتا ہے جیسے:

اُن کے بچوں کو تنگ مت کرو ایسا نہ ہو کہ وہ خفا ہو جائے۔

بعض اوقات اسمی جملہ کسی دُعا یا تمنا کے اظہار کے لیے بولا جاتا ہے مثلاً:

مجھے اُمید ہے کہ وہ مجھے میری رقم دے دے گا۔

اللہ کرے کہ میرا بیٹا اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے۔

تابع جملے میں ناممکن یا محال کا ذکر ہو تو ''کہ'' کی بجائے ''جو'' آئے گا۔ جیسے:

اُس کی کیا جرأت ہے جو وہ میرے سامنے ایسی حرکت کرے۔

درج بالا اسمی جملوں میں استعمال ہونے والے تمام حروف سے دو دو جملے بنائیں۔

فارغ بخاری

ولادت: ۱۹۱۷ء وفات: ۱۹۹۷ء

سید میر احمد شاہ بخاری پشاور میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے اُن کی طبیعت میں جولانی تھی۔ وہ صرف تیرہ سال کی عمر میں ''نوجوان بھارت سبھا'' میں شامل ہوگئے، جس نے تحریکِ آزادی میں متشدّدانہ کردار ادا کیا۔ تحریکِ آزادی اور قیامِ پاکستان کے بعد جمہوریت اور اظہارِ آزادی کے لیے جدوجہد میں بار ہا قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔

وہ بنیادی طور پر ایک سکالر اور شاعر تھے۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانیوں میں سے تھے۔ اُنھوں نے رضا ہمدانی کے ساتھ مل کر ماہنامہ ''سنگِ میل'' کا اجرا کیا۔ ان دونوں نے پشتو زبان و ادب و ثقافت سے متعلق بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں ادبیاتِ سرحد، پشتو لوک گیت، سرحد کے لوک شاعر، پشتو شاعری اور پشتو نثر شامل ہیں۔ زیر و بم، شیشے کے پیراہن، خوشبو کا سفر، پیاسے ہاتھ، غزلیہ، اور پھُٹرا سا دل اُن کی شاعری کے مجموعے ہیں۔ اُنھیں ۱۹۹۵ء میں صدارتی ایوارڈ برائے حسنِ کارکردگی سے نوازا گیا۔

تصانیف: باچا خان، البم، براتِ عاشقاں (نثر)۔

طائرِ لاہُوتی

اہل قلم کو کوزے میں دریا بند کرنے کے سلیقے پر بڑا فخر ہے، لیکن بعض دریا ایسے سرکش ہوتے ہیں کہ انہیں کوزہ تو کیا، سمندر میں بھی بند کرنا محال ہوتا ہے۔ ضیاؔ جعفری مرحوم علم و فضل کے ایسے ہی دریا تھے۔ سیاست سے صحافت تک اور ادب سے تصوف تک ان کی فتوحات کا سلسلہ اس قدر وسیع ہے کہ قدم قدم پہ..............................

؏ کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

غالبؔ نے کہا تھا

؎ ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ
مجنوں جو مرگیا ہے، تو جنگل اداس ہے

ضیاؔ کے انتقال سے بھی پشاور پر کچھ ایسی ہی واردات گزری۔ شعر و ادب سے تو وہ سجادہ نشین ہونے کے بعد ہی کٹ چکے تھے، پھر بھی ان کی سرپرستی ادبی حلقوں کے لیے غنیمت تھی۔ ان کی وفات سے تو جیسے ادبی محفلوں کی رونق چھن گئی، دل بجھ گئے۔

وہ بچپن میں ایک چھلاوا اور جوانی میں سحرِ مجسم تھے۔ جس راستے سے گزرتے وہ راستہ قوسِ قزح میں نہا جاتا، جس محفل میں براجمان ہوتے وہ محفل ان کی طلسمی خوشبو سے مہکنے لگتی، جو لباس بھی پہنتے، ان پر یسا پھبتا گویا اُن کے بانکپن سے اس لباس کو زینت ملی ہو.......... آخری عمر میں ان کی بزرگانہ شفقت، سنِ اخلاق، محبت اور خلوص کے تصور سے میرے دل میں اُس بوڑھے برگد کی یاد جاگ اٹھتی ہے، جو شاہی غ، پشاور کے مغربی کونے میں ایک وسیع رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ یہ کرسیوں والے درخت کے نام سے مشہور

NOT FOR SALE

تھا۔ اس لیے کہ اس کے تنے کو تراش کر بڑے سلیقے سے اوپر نیچے بہت سی نشستیں بنا دی گئی تھیں، جہاں گرمیوں کی جھلسا دینے والی دھوپ اور زمہریر سردیوں کی طوفانی ہواؤں اور یخ بستہ فضا سے بچنے کے لیے لوگ اس کے گھمبیر سائے میں پناہ لیتے تھے۔ اس صدیوں پرانے بزرگ برگد سے پشاور شہر کے لوگوں کی دوستی اتنی پختہ ہوگئی تھی کہ جب کسی تعمیر کے سلسلے میں اسے کٹوایا گیا تو اہل شہر کو بڑا شاق ہوا اور وہ اب تک بڑے ارمانوں کے ساتھ اس عظیم درخت کو یاد کرتے ہیں۔

ضیاؔ صاحب کا بڑھاپا بھی ان کے احباب، ان کے شاگردوں اور ان کے ارادت مندوں کے لیے اس سایہ دار برگد سے کم نہ تھا اور ان کی دائمی مُفارقت پر بھی انھوں نے یوں محسوس کیا جیسے ان کا سہارا چھن گیا ہو، جیسے وہ یتیم ہوگئے ہوں۔

ضیا صاحب ہمارے پڑوس میں رہتے تھے۔ ہمارا گھر گور گٹھڑی کے دروازے سے ذرا اترائی پر تھا، ضیاؔ اس کے جنوبی گنبد کے بالمقابل چڑھائی پر رہتے تھے۔ میں بچپن سے دو سرخ و سپید، سروقد نوجوانوں کو کبھی کبھی اس سڑک پر خراماں خراماں گزرتے دیکھتا، ایک عرصے کے بعد جب میں نے ہوش سنبھالا تو پتا چلا کہ یہ حضرات یہاں کے مشہور شاعر ضیاؔ جعفری اور عبدالودود قمرؔ ہیں۔

میں نے اس شاعرانہ ماحول میں آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی اپنے اندر کوئی غیر معمولی کیفیت محسوس کرنے لگا۔ جہاں کسی شاعر کا نام سنا، بے اختیار دل اس کی طرف کھنچنے لگا۔

؏ اس خاک کے ذروں میں شراروں کا شرف تھا

ضیاؔ اور قمرؔ کے شاعر ہونے کا اِنکشاف بھی ان دو خوبرو نوجوانوں سے میری دلچسپی کا باعث بن گیا، لیکن اس وقت میری عمر اتنی کچی تھی کہ ان سے دوستی کا ارمان پورا نہ ہوسکا۔

۱۹۳۵ء میں رضاؔ بھائی نے ضیاؔ جعفری سے تعارف کرایا، تو میں نے ڈرتے ڈرتے ان سے ہاتھ ملایا۔ یہ باغ و بہار انسان پہلی صحبت ہی میں یوں گھل مل گیا، جیسے برسوں کی شناسائی ہو، رندی و سرمستی سے لے کر شعر و ادب، فلسفہ اور تصوف تک، ہر موضوع پر ان کی باتیں اتنی دلچسپ اور فکر انگیز تھیں کہ میں تو جیسے

NOT FOR SALE

مسحور ہو کر رہ گیا۔

صوبہ سرحد میں اردو ادب کے دورِ جدید کا آغاز دائرۂ ادبیہ کے قیام سے ہوا۔ یہ ادارہ ضیا جعفری اور قمر صاحب کی مثالی دوستی کی یادگار تھا۔ اس تنظیم میں نذیر مرزا برلاس، مظہر گیلانی، مبارک جبین عاجز، امیر انور ضیائی، مضطر تاتاری، جگر کاظمی اور خالص ملی شامل تھے۔ میری حیثیت اس وقت ایک مبتدی کی تھی۔ دائرۂ ادبیہ میں پہنچ کر ضیا کی شفقت اور توجہ سے بہت کچھ سیکھا۔ وہاں کے علمی و ادبی ماحول نے مجھ میں خود اعتمادی پیدا کی، وہاں کی تربیت نے مجھے روشنی عطا کی اور میرے اندر تخلیق کی سچی لگن کو جنم دیا۔

ضیا کی شخصیت بھڑکیلے اور چکا چوند پیدا کرنے والے رنگوں کا مجموعہ تھی۔ ہر رنگ مہکتا ہوا، دھڑکتا ہوا۔ سیاست میں وہ یہاں "نوجوان بھارت سبھا" کے بانیوں میں سے تھے۔ صحافت میں وہ ۱۹۳۰ء میں روزنامہ "انگار" کے ایڈیٹر رہے اور ان کے ساتھ عبدالودود قمر نائب مدیر تھے۔ اس کے بعد بھی آپ متعدد اخباروں کی ادارت کرتے رہے۔ ادب میں وہ ایسی دلآویز شخصیت تھے۔ جسے ادبیاتِ سرحد کی تاریخ کا سنہری باب کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ یہاں جدید ادبی دور کے سالارِ کارواں تھے۔ اردو اور فارسی کے نامی گرامی شاعر تھے، دونوں زبانوں میں رباعی میں وہ نام کمایا کہ "خیامِ سرحد" کہلائے۔ غزل پر بھی بڑی دسترس حاصل تھی اور یہاں نظم کو رواج دینے میں بھی اُن کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ نثر میں تنقید، ڈرامہ، ریڈیائی فیچر سب کچھ لکھا۔ نئی نسل میں اس خطے کے تمام مشہور شعرا و ادبا کی فنی تربیت میں بھی آپ کا بڑا حصہ ہے۔

صوفی منش ہونے کے سبب روشن خیال اور وسیع المشرب واقع ہوئے تھے۔ پشاور سے بریلی تک آپ کے عقیدت مندوں کا حلقہ پھیلا ہوا تھا۔ دائرۂ ادبیہ کا چھوٹا سا دفتر، جو محلہ شاہ ولی قتال قصہ خوانی میں واقع تھا، ضیا کی ہمہ رنگ شخصیت کا آئینہ دار تھا، جہاں ادیبوں، سیاستدانوں، آرٹسٹوں، صحافیوں، مجذوبوں اور علما و فضلا کا ہر وقت جمگھٹا لگا رہتا۔

ادیبوں سے شعر و ادب پر بحث کرتے کرتے یکایک جیسے ضیا کے اندر گھنٹی بجتی اور سیاست کا پیریڈ شروع ہو جاتا۔ اسی طرح آرٹ کا، صحافت کا پیریڈ بدلتا رہتا اور پھر اچانک "یاہو" کا نعرہ لگاتے ہی وہ

آنکھیں بند کر کے اپنے اندر ڈوب جاتے اور گھنٹوں دفتر کے ایک گوشے میں بیٹھے مراقبے میں نظر آتے۔ اسی اعتبار سے ہم انہیں "طائرِ لاہوتی" کہنے لگے۔ وہ زاہدِ خشک نہیں تھے۔ رنگین مزاج زندہ دلی کا مجسمہ، سنجیدہ سے سنجیدہ گفتگو میں ان کی رگِ ظرافت پھڑک اٹھتی، تو ایک ایسا فقرہ جڑ دیتے کہ حاضرین حیران و پریشان اُن کا منہ تکنے لگتے۔

ضیا صاحب اور ان کے ساتھی عبدالودود قمر کی دوستی سارے شہر میں ضرب المثل بن چکی تھی، وہ ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ حسنِ اتفاق کہ دونوں ادب کے رسیا بھی تھے، دونوں کو تصوف کی چاٹ بھی تھی اور سیاست کی بھی۔ البتہ ان کے سیاسی نظریات خاصے مختلف تھے اور یہی اختلاف بسا اوقات ان کے مابین محاذ آرائی کا سبب بنتا۔ قمر صاحب سے ان کی نوک جھونک اکثر لڑائی کا پیش خیمہ بن جاتی۔ ضیا صاحب بھری محفل میں ان پر برسنے لگتے۔ قمر صاحب جذباتی اور تند مزاج ہونے کے باوجود ضیا صاحب کا بے حد احترام کرتے، جب ضیا صاحب کا پارہ چڑھ جاتا، تو دبک جاتے اور لطف یہ کہ تھوڑی دیر ہی میں وہ پھر اسی طرح ہنستے بولتے اور چہلیں کرتے دکھائی دیتے۔

یہ چاند سورج کی جوڑی صوبہ سرحد میں اردو زبان و ادب کی ترویج کے لیے نیک فال ثابت ہوئی۔ دائرۂ ادبیہ میں ان دونوں ساتھیوں کی سنگت سے جدید ادب کا یہ پودا جلد ہی پھولنے پھلنے لگا۔ ضیا بڑے شاعر اور ادیب تھے، ان کی رنگا رنگ شخصیت کی جاذبیت اور فن کے جادو کے زور سے نئی نسل کے شاعر، ادیب ان کی طرف کھنچے چلے آتے، لیکن انتظامی امور میں وہ بالکل کورے تھے۔ خلاف اس کے قمر بڑے فنکار نہ سہی، لیکن انتظامی اہلیت میں علامہ ہیں۔ وہ ایک ان تھک کام کرنے والے عملی انسان ہیں۔ دائرۂ ادبیہ کے لیے چندہ جمع کرنے کے علاوہ مشاعروں کا اہتمام، پبلسٹی کا انتظام اور مہمانوں کی مدارت تک ان کے ذمہ تھی، وہ ایسے کھرے اور بااصول انسان ہیں، جن کی بے رحم صاف گوئی سے اپنا بیگانہ کوئی محفوظ نہیں۔ اسی اصول کے تحت انھوں نے اس ادارے کو نظم و ضبط کے اعتبار سے ایک مثالی ادارہ بنا دیا تھا۔ سب ان کا احترام

کرتے اور ان کی تلخ کلامی کو ہنسی خوشی برداشت کرتے تھے۔ مسلّمہ حقیقت ہے کہ ضیاؔ کی ادبی شہرت و قبولیت قمرؔ کی رہینِ منت تھی اور اسے مسندِ ارشاد کے مقام تک پہنچانے میں قمرؔ کی مخلصانہ کوششوں کا بڑا حصّہ ہے۔

ضیاؔ دائرہ ادبیہ کے صدر تھے، قمرؔ ناظمِ اعلیٰ اور کرتا دھرتا تھے، ان کا رعب مجھ پر ہمیشہ اس قدر غالب رہا کہ کبھی بے تکلف ہونے یا کھل کر بات کرنے کی آج تک جرأت نہ ہوسکی۔ وہ بحیثیت سید میرا احترام بھی شرمسار کرنے کی حد تک کرتے، لیکن ذرا سی غلطی یا فروگذاشت پر ڈانٹ بھی دیتے۔ قمرؔ صاحب سے بظاہر استادی شاگردی کا ناتا نہیں تھا، لیکن در حقیقت مجھے نثر میں قلم پکڑنا انھوں نے ہی سکھایا۔ مشاعروں کی روداد لکھواتے، اس کی تصحیح کرتے، زبان، محاورے اور روزمرہ کی غلطیوں کی طرف توجہ دلاتے۔ نتیجہ یہ کہ ان کے سامنے خاصی احتیاط برتنا پڑتی۔ یہی نہیں بلکہ محفل میں اٹھنے بیٹھنے، بات کرنے اور پڑھنے کے آداب سکھانے میں بھی وہ بڑی سختی برتتے۔ ذرا سی بے احتیاطی پر اتنی سخت جھاڑ ملتی کہ آئندہ کبھی بھول کر بھی کوئی لغزش نہ ہوتی۔ ان کی عقابی نظریں ہمیشہ ہماری حرکات و سکنات کا جائزہ لیتی رہتیں۔ نوجوانی کا عالم تھا کبھی بے جوڑ لباس پہن کر آجاتے، تو مذاق مذاق میں تخجل کرتے۔ یہ کیا بیہودہ لباس پہنا ہے، لوگ کیا کہیں گے کہ شاعر ادیب ہو کر لباس پہننے کی تمیز نہیں۔ غرض انھوں نے ہر نہج پر ہماری تہذیب و تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ آج ہم فخر سے یہ کہہ سکتے ہیں.............

ع ہم ہوئے جو کچھ، وہاں رہ کر ہوئے

حوصلہ افزائی کا یہ عالم کہ میں جو اس ادبی ماحول میں طفلِ مکتب بھی نہ تھا، چند دنوں ہی میں قمرؔ صاحب نے مجھے لائبریرین بنادیا۔ یہ میرے لیے اُس وقت اتنا بڑا اعزاز تھا کہ پھولے نہ سمایا اور نہایت ذوق و شوق سے اس مختصر سی لائبریری کی ترتیب میں منہمک رہنے لگا۔ پھر اگلے سال نائب ناظم کی ذمہ داری سونپ دی گئی، جسے نبھانے کے لیے اور خود کو اہل ثابت کرنے کے لیے بڑے جتن کرنے پڑے۔

ضیاؔ کی شخصیت جمالیات کا مظہر تھی۔ اللہ والے تھے۔ بٹالہ شریف کی گدی کے مرید تھے، حج کر کے آئے، تو سجادہ نشین بن گئے۔ سجادہ نشین بنتے ہی ان کے مریدوں میں اضافہ ہوتا گیا، پشاور سے کراچی تک پھیل گئے اور یہ مصروفیت اتنی بڑھی کہ وہ ادب اور ادبی دنیا سے یکسر کٹ کر رہ گئے۔ کبھی کبھی نعت یا منقبت کہہ لیتے، البتہ جب بھی ملاقات ہوتی، کہتے غزلیں سناؤ، جھوم جھوم کر سنتے اور داد دیتے۔

ہارٹ اٹیک ہوا، کئی دن سے ان کی حالت اچھی نہ تھی۔ میں کراچی مشاعرہ پڑھنے جارہا تھا۔ جانے سے ایک دن پہلے خاطر کے ساتھ انھیں دیکھنے گیا۔ بڑے ہشاش بشاش نظر آرہے تھے، چہرے پر وہی سرخی طبیعت میں وہی شوخی اور اس کے بعد جو ضیاؔ صاحب فارم میں آئے، تو اس طرح چہکنے لگے کہ معلوم ہوتا تھا کبھی بیمار تھے ہی نہیں۔ ماضی کے واقعات ایک ایک کر کے یاد کرتے اور قہقہے لگاتے رہے۔ مشاعروں کے لطیفے، اپنی حماقتیں، دوستوں کی رقابتیں، چشمکیں، مجادلے، مناظرے اور مہم جوئی کے حالات، یوں لگتا جیسے عہدِ رفتہ کی کتاب کھل گئی ہو، اُس وقت ان کی گل افشانیِ تقریر دیدنی تھی، یہاں تک کہ دوپہر سے شام ہوگئی اور ہم جب رخصت ہونے لگے تو بادل نخواستہ انھوں نے خدا حافظ کہا۔

میں چار پانچ دن کے بعد کراچی سے لوٹا، تو گھر میں داخل ہوتے ہی بچوں نے ضیا صاحب کے انتقال کی روح فرسا خبر سنائی۔ مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ وہ چہکتا مہکتا ضیاؔ ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوگیا ہے۔

ضیاؔ ادبیاتِ سرحد کا ایک رنگین باب تھا، وہ ایک مکتبۂ فکر، ایک تحریک تھا، اُن کی ادبی و علمی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ انھوں نے یہاں علم و ادب کے چراغ روشن کیے، ان کی روشنی اور اس سدا بہار پھول کی خوشبو ہمیشہ دلوں کو منوّر کرتی اور مہکاتی رہے گی۔

(البم)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے جوابات لکھیں۔

(الف) مصنف نے ضیاؔ جعفری کو بوڑھے برگد سے کیوں تشبیہ دی؟

(ب) ضیاؔ جعفری کا گھر کہاں واقع تھا؟

(ج) دائرۂ ادبیہ میں کون کون شامل تھے؟

(د) عبدالودود قمرؔ کون تھے؟

(ہ) قمرؔ صاحب دائرہ کے اصول وضوابط کیسے برقرار رکھتے تھے؟

(و) شاعروں کے بارے میں مصنف کے کیا جذبات تھے؟

۲۔ خالی جگہ پُر کریں۔

(الف) ضیاؔ جعفری ایسے دریا تھے جنھیں ______ میں بند کرنا بھی محال تھا۔

(ب) محفل اُن کی طلسمی خوشبو سے ______ لگتی۔

(ج) جب میں نے ______ سنبھالا تو پتا چلا کہ یہ دونوں حضرات مشہور شاعر ہیں۔

(د) ضیاؔ جعفری روشن خیال اور ______ تھے۔

(ہ) ضیاؔ اور قمرؔ کی دوستی سارے شہر میں ______ تھی۔

(و) درحقیقت مجھے قلم ______ قمرؔ صاحب نے ہی سکھایا۔

(ز) سنجیدہ گفتگو میں بھی اُن کی رگِ ظرافت ______ اُٹھتی۔

۳۔ درج ذیل الفاظ پر اعراب لگائیں اور الفبائی ترتیب سے لکھیں۔

نظم وضبط، مشاعرہ، مقالات، تلخ کلامی، جاذبیت۔

۴۔ درج ذیل جملوں میں مناسب مقامات پر رموزِ اوقاف لگائیں۔

(الف) عمران خان نے جو پاکستان کا نامور فرزند ہے کینسر ہسپتال بنایا۔

(ب) جھیل سیف الملوک تک جو سارا پہاڑی علاقہ ہے سفر آسان نہیں ہے۔

(ج) سنو کیا تم میری مدد کرو گے۔

(د) ماشاء اللہ کتنی ذہین بچی ہے۔

(ہ) بچے بولے ماموں جان آگئے۔

۵۔ درج ذیل جملوں کو قواعد کے مطابق درست کریں۔

(الف) نیز شاعر کا نام بھی لکھیں۔

(ب) ہمارا گھر شہر میں واقعہ ہے۔

(ج) بزرگوں کی بات کو غور سے سنو۔

(د) تم کب واپس لوٹو گے۔

(ہ) تم نے کیوں شور ڈالا ہے۔

(و) میں آپ کا بے حد مشکور ہوں۔

۶۔ اس سبق میں سے محاورات کی نشان دہی کریں۔

* کل گدھے پر جا کر نظم پڑھنا اور بیس روپے کا چیک لانا۔

ایسا کلام کہنا جس کے دو معنی نکل سکتے ہوں اور دونوں ایک دوسرے کے برعکس ہوں محتمل الضدین کہلاتا ہے۔ مثلاً اس جملے کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ کل جانا اور "گدھے" پر نظم پڑھنا اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ گدھے پر بیٹھ کر جانا اور نظم پڑھنا۔ اس طرح کی پانچ مثالیں تلاش کر کے لکھیں۔